سید ہاشم علی اختر

(وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۱۹۸۴ء-۱۹۸۹ء)

از پروفیسر محمد اقبال
شعبۂ علم نباتات، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی

ہاشم صاحب نے ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو حیدرآباد کے محلّہ قطبی گوڑہ میں آنکھیں کھولیں۔ آپ کے والد جناب سیّد حنیف صاحب اردو فارسی کے استاد تھے اور بعد میں ناظر تعلیمات کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ہاشم علی کے دادا جناب شاہ محی الدین صاحب ایک عرب نژاد بزرگ تھے جنہوں نے ٹراونکور اسٹیٹ میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ ہاشم علی ابتدا ہی سے غیر معمولی شخصیت کے حامل رہے جب وہ مدور مڈل اسکول (ضلع نلگنڈہ) میں چھٹی کلاس میں داخل ہوئے تو انگریزی کے استاد نے انہیں روزانہ انگریزی کتاب سے ایک صفحہ خوشخط نقل کرنے کی تاکید کی۔ مگر پہلے ہی روز ان کی تحریر دیکھ کر انہیں اس ہوم ورک سے مستثنیٰ کردیا۔ ایک بار صدر مہتمم تعلیمات اسکول کے معائنے کے لیے آئے۔ لائبریری کے رجسٹر میں بار بار ایک ہی نام دیکھ کر انہیں اس طالب علم سے ملنے کا اشتیاق ہوا۔ یہ پوچھے جانے پر کہ کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں، طالب علم نے جواب دیا کہ لائبریری میں موجود تمام کتابیں پڑھ چکا ہوں۔ صدر مہتمم نے امتحان کے طور پر ایک کتاب نکالی اور اس کے مشمولات کے بارے میں سوالات کیے۔ جواب بڑے مفصّل اور اطمینان بخش تھے۔ معائنہ کار نے اپنی رپورٹ میں لکھا .....''اس اسکول میں ایک طالب علم سید ہاشم علی کے علاوہ کوئی اور کتابیں نہیں پڑھتا ہے''۔

۱۹۴۴ء میں ایم۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد ہاشم صاحب نے ملازمت کی ابتدا سائنس ٹیچر اور پھر لیکچرر زوالوجی (سٹی کالج، حیدرآباد) کی حیثیت سے کی۔ بعد ازاں حیدرآباد سوِل سروس (۱۹۴۶) کے امتحان میں پہلا مقام حاصل کرکے سر اکبر حیدری گولڈ میڈل حاصل کیا اور ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے محکمۂ مالیات سے وابستہ ہوگئے۔ بعد ازاں کئی اضلاع میں کلکٹر بھی رہے۔ ۱۹۵۴ء میں انہیں IAS کیڈر دیا گیا۔ مگر اس موقع پر ان کی سینیارٹی کے سات آٹھ سال مارے گئے۔ ۱۹۶۰ء میں گورنر آندھراپردیش (بھیم سین سچّر) نے کھمّام ضلع کا دورہ کیا جہاں ہاشم علی صاحب کلکٹر تھے۔ گورنر موصوف ان کے حسن انتظام اور حسن کردار سے اتنا متاثر ہوئے کہ حیدرآباد واپس آتے ہی ان کو گورنر کا سیکریٹری مقرر کردیا۔ بعد میں سید ہاشم علی کمانڈ ایریا ڈیولپمنٹ کے پہلے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ یہ ایسا محکمہ تھا جس کے خد و خال ابھی واضح نہیں تھے۔ اس کا مقصد آبپاشی کے طریقوں کو بہتر کرنا تھا تاکہ اغذیہ کی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہوسکے۔ اس میدان میں آپ نے اس درجہ شہرت حاصل کی کہ کئی افریقی اور جنوب ایشیائی ممالک کے علاوہ فرانس جیسے ترقی یافتہ یوروپی ملک نے موصوف کو اپنے آبپاشی پراجیکٹوں میں مدد کے لئے مدعو کیا۔ آبپاشی کے ضمن میں ورلڈ بینک سے گفت و شنید کیلئے انہیں ایک وفد کے ہمراہ واشنگٹن بھیجا گیا۔ آبپاشی کے مسائل پر وہ ورلڈ بینک اور فورڈ فاؤنڈیشن کے مشیر بھی رہے۔ ورلڈ بینک کی ایما پر انہوں نے انڈونیشیا کے آب پاشی نظام پر دو جلدوں کی ایک رپورٹ بھی مرتب کی تھی۔

کمانڈ ایریا ڈیولپمنٹ کا محکمہ پوری طرح مستحکم ہوجانے پر ہاشم علی صاحب کو زراعتی پیداوار کا کمشنر بنایا گیا۔ وہ کئی تحقیقاتی کمیشنوں کے سربراہ بھی رہے۔ چھ سال تک وہ آندھراپردیش وقف بوڈ کے ممبر رہے اور ایک بار کمیشن برائے تحقیقات وقف بورڈ کی ذمّہ داری بھی نبھائی۔ کچھ دنوں ہاشم صاحب نے رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ جب انہوں نے اس محکمہ کا چارج سنبھالا تو یہاں مکمل جمود کی کیفیت تھی۔ عملے کی ترقی برسوں سے رکی ہوئی تھی اور پنچایت سمیتی کے عملے میں تخفیف کی جارہی تھی۔ ہاشم صاحب جانتے تھے کہ عہدیداروں میں خوش دلی کی فضا مفقود ہو تو کارگزاری میں اضافہ ممکن نہیں۔ کافی سوچ بچار کے بعد انہوں نے ایک اسکیم صوبائی حکومت کو بھیجی جس میں محکمے کے انتظامی ڈھانچے کو تین درجوں میں، یعنی تعلّقہ، ڈویزن اور ضلع کی سطح پر، تقسیم کرنے کی سفارش کی جیسا کہ محکمہ مالیات میں پہلے سے رُوبہ عمل تھا۔ حکومتی سطح پر یہ تجویز پسند کی گئی، نیتجتاً بہت سے عملے کی گنجایش نکل آئی اور ترقی کی راہیں بھی کھُل گئیں۔ پورے محکمے میں ہاشم صاحب کی جے جے کار ہوگئی۔ ان کا دوسرا کارنامہ پسماندہ طبقات کے لیے امداد باہمی

ٹانڈہ (فیض آباد) سے شائع ہونے والے ماہ نامہ ''دوام نو'' کے مارچ ۱۹۸۸ء کے شمارے میں خاکسار کا ایک انٹرویو شائع ہوا۔ کچھ عرصہ قبل یونیورسٹی میں 'یوتھ فیسٹیول' کا انعقاد ہوا تھا جس پر بہت سے لوگوں کو سخت اعتراض تھا کیونکہ اس پروگرم کے مشمولات یونیورسٹی کے مخصوص کلچر سے ہم آہنگ نہ تھے' اُدھر ہاشم صاحب طلبا یونین کے دستور میں کچھ تبدیلیاں لانا چاہتے تھے جسکی طلبا برادری کی جانب سے زبردست مخالفت ہورہی تھی' پھر شعبۂ علم نباتات میں عقبی دروازے سے داخل کیے گئے اسٹاف کا معاملہ بھی ابھی گرمایا ہوا تھا' لہٰذا تبصرے کے لیے اچھا خاصا مواد میسّر تھا۔ شیخ الجامعہ اور یونیورسٹی کے بارے میں کیے گئے چند سوالوں کے جواب میں احقر نے بنا کسی لاگ لپیٹ کے وہ سب کچھ کہہ دیا جو محسوس کرتا تھا۔ لہٰذا بات کچھ چٹپٹی ہوگئی اور یونیورسٹی کیمپس میں اس کا کافی چرچا ہوا۔ کسی کرم فرما نے مذکورہ شمارے کی کاپی شیخ الجامعہ کی میز تک بھی پہنچادی۔ چند روز بعد ہی وی سی آفس سے طلبی کا حکم آگیا۔ موضوع سخن کا مجھے اندازہ تھا ہی' لہٰذا تیاری کے ساتھ حاضر خدمت ہوا۔ ہاشم صاحب میری لب کشائی پر برہم تھے۔ جب انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس کوئی علمی کام کرنے کو نہیں رہ گیا ہے کہ خرافات میں مبتلا ہوگئے ہو؟' تو جواب میں راقم نے اپنی زیر تصنیف کتاب "The Vascular Cambium" کے ابواب انہیں دکھائے اور بتایا کہ کئی بین الاقوامی اشاعت گھر اسے شائع کرنے کو تیار ہیں اور شعبۂ نباتیات کی تاریخ میں بیرون ملک سے شائع ہونے والی یہ پہلی کتاب ہوگی۔ یہ بھی بتایا کہ ہر ماہ اپنی تنخواہ سے کچھ رقم پس انداز کرکے میں اس پر صرف کرتا ہوں، وسائل کی کمی کے باعث کام کی رفتار تھوڑی سُست ہے۔ یہ سن کر ہاشم صاحب کا مزاج فوراً ہی بدل گیا۔ انھوں نے پوری توجہ سے فائل کا جائزہ لیا۔ پبلشرز کے ساتھ ہوئی خط و کتابت پر نگاہ ڈالی اور پھر فرمایا' 'متوقع اخراجات کی تفصیل دیتے ہوئے یونیورسٹی سے مدد مانگو۔ جو لوگ کام کرتے ہیں' میں ان کا دوست ہوں''۔ ہاشم علی صاحب سے ناچیز کی یہ دوسری ملاقات تھی۔ کچھ دنوں بعد رجسٹرار آفس سے اطلاع ملی کہ مذکورہ مسودے کی تیاری کے لیے وائس چانسلر صاحب نے دس ہزار روپے کی رقم منظور کردی ہے۔

کی انجمنوں کا قیام تھا۔ انہوں نے دھوبی، حجام، رکشہ پُلر، ڈرائیور، اورٹھیلہ بنڈی چلانے والے افراد کے لیے الگ الگ انجمنیں تشکیل کرا کے ان کو دس فیصد رقم متعلقہ کارپوریشن سے، اور پچاسی فیصد رقم بینک قرض کے طور پر فراہم کرادی۔ یہ اسکیم بہت کامیاب رہی۔ پانچ سات برس کے اندر ڈرائیور اپنی گاڑیوں کے مالک بن گئے اور دوکانوں کے ملازمین خود اپنی دکانیں چلانے لگے۔ اس طرح قانون اور ضابطے کے تحت کوشش کر کے ہاشم صاحب نے پسماندہ طبقات کوفلاحی اسکیموں کا پورا فائدہ پہونچایا۔ موصوف کی فعّالیت سے جھلّائے ہوئے فرقہ پرست عناصر کی جانب سے ان پر اقلیتوں کی بے جا حمایت کا الزام لگایا گیا۔

ہاشم صاحب کچھ عرصہ پرنسپل سیکریٹری بھی رہے۔ جب وہ صوبائی آبپاشی کمیشن کی حیثیت سے کام کر رہے تھے (یہ عہدہ اڈیشنل سیکریٹری، گورنمنٹ آف انڈیا کے مساوی تھا) تو آندھرا حکومت نے انہیں عثمانیہ یونیورسٹی کی سربراہی سنبھالنے کو کہا' جہاں اُن دنوں لا اینڈ آرڈر کی ناگفتہ بہ حالت کے پیش نظر ایک مستقل پولیس اسٹیشن قایم کرنے کی تجویز زیر غور تھی۔ یونیورسٹی میں طلبا اور اساتذہ کے مختلف گروہوں کے درمیان کھلے بندوں تصادم روزمرّہ کا معمول تھا۔ طلبا کی سیاست پر یہاں سنگھ پریوار کا قبضہ تھا۔ ایک مسلمان افسر کی سربراہی کی خبر پا کر جامعہ عثمانیہ کی سیاست میں ابال آ گیا اور کافی عرصہ یہ تقرر التوا میں رہا۔ جب نئی سرکار بنی تو چیف منسٹر وجے بھاسکر ریڈی نے ہاشم صاحب کے تقرر پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ اور دسمبر ۱۹۸۲ء میں کرسمس کی چھٹیوں کے دوران موصوف کو یونیورسٹی کا چارج دے دیا گیا جہاں ان دنوں خالص جنگل راج کا تسلّط تھا۔ بیوروکریٹ کی حیثیت سے ایک کامیاب اور باوقار مدّت کار پوری کرنے کے بعد ہاشم صاحب کے سامنے یونیورسٹی نظم ونسق کا ایک نیا چیلنج تھا جس کا ان کو کوئی تجربہ بھی نہیں تھا۔ چارج سنبھالتے ہی فرقہ وارانہ نفرت سے آلودہ مخالفتوں کا طوفان امڈ آیا اور اکھل بھارتیہ ودیارتھی پریشد کے غنڈے بے لگام ہو گئے۔

اساتذہ سے خطاب کرتے ہوئے اپنی پہلی تقریر میں ہاشم صاحب نے اپنے بنیادی طور پر استاد ہونے کو اس طرح واضح کیا کہ ''جس وقت میں سائنس کا لیکچرر تھا، آپ میں سے بہت سوں نے میٹرک بھی کامیاب نہیں کیا تھا''۔ اسی تقریر میں انہوں نے واضح طور پر اعلان کیا۔ ''میں مسلمان ہوں اور مسلمان ہونے پر مجھے فخر ہے، لیکن یونیورسٹی میں جو فیصلے میں کرونگا وہ محض انصاف اور غیر جانبداری پر مبنی ہوں گے، ان میں میرا مسلمان ہونا کبھی دخل انداز نہ ہوگا''۔ باشعور طبقے کی حمایت ہاشم صاحب کو مل گئی مگر وہاں اکثریت ان کی تھی جن کے ذہنوں میں ہمیشہ شیاطین کبڈّی کھیلتے ہیں۔ ایک دن غنڈوں کا ایک ہجوم وائس چانسلر کے دفتر میں آن گھسا اور ہر طرح کی بدتہذیبی کا اظہار کیا۔ شیخ الجامعہ کو نازیبا کلمات کہے اور دھمکیاں دیں کہ یونیورسٹی میں تمہاری افسری نہیں چل پائے گی۔ اس تذلیل آمیز رویّہ سے ہاشم صاحب بہت دل برداشتہ ہوئے۔ نصف شب تک عالم کشمکش میں رہے اور پھر انہوں نے اس غلیظ ماحول سے کنارہ کش ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ تمام حالات و واقعات کو تفصیل سے قلم بند کرتے ہوئے انہوں نے گورنر (یونیورسٹی کے چانسلر) کے نام اپنے استعفے کا ایک طویل خط تیار کیا۔ اس موقع پر بیگم وحید ہاشم علی نے جسارت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اوّل تو آپ کو یہاں آنا نہیں چاہئیے تھا، اور اب آ ہی گئے ہو تو ہارنا نہیں چاہئیے''۔ ہاشم صاحب نے مراسلے کے آخری صفحے کو بدل کر، استعفیٰ پیش کرنے کے بجائے یہ لکھدیا کہ ان ناگفتہ بہ حالات میں وہ بہت سخت اقدامات کرنے کے خواہشمند ہیں، کیونکہ یونیورسٹی فرقہ پرست غنڈہ عناصر کی آماجگاہ بن گئی ہے جسے وہ یونیورسٹی سے وابستہ رہتے ہوئے برداشت نہیں کر سکتے۔ انہوں نے واضح کیا کہ ''اگر چانسلر اور حکومت کو یہ منظور نہیں ہے تو میں استعفیٰ دینے کو تیار ہوں''۔ راج بھون اور صوبائی سرکار دونوں کی طرف سے گرین سگنل آ گیا۔ ''جیسے چاہو حالات کو قابو میں کرو، ہم پوری طرح ساتھ دیں گے''۔

ہاشم صاحب نے سخت ڈسپلن کے ضوابط جاری کر دیئے۔ ایک انگریزی اخبار نے جاری شدہ احکامات پر عوام کی رائے طلب کی تو اکثریت نے تائید کا اظہار کیا۔ جلسے جلوس پر کچھ عرصہ کے لئے پابندی لگا دی گئی، پھر بھی جلوس نکلے تو پولس نے زوردار خبر لی۔ طالبات کو سامنے کیا گیا تو ان کی بھی اسی انداز میں مزاج پرسی کی گئی۔ تین دن لاٹھی گھومی۔ چوتھے روز سنّاٹا بھی تھا اور امن وامان بھی۔ ان دنوں وہاں پر بنا نقل کیے امتحان کا کوئی تصور نہیں رہ گیا تھا۔ اس کے خلاف لب کھولنا بھی شامت کو دعوت دینا تھا۔ ابتدا میں جن اساتذہ نے مزاحمت کی ان کو زدوکوب کیا گیا۔ ان حالات کے پیش نظر ہاشم صاحب نے ہر کلاس کو چار مختلف مراکز پر بانٹ کر امتحان کرائے، امتحان گاہ میں داخلے سے پہلے جامہ تلاشی کو لازمی کیا گیا۔ تین تین اساتذہ کی معیت میں ۴۵ فلائنگ اسکواڈز بنائے گئے جو امتحان کے تمام مراکز پر منڈلاتے رہتے تھے۔ تمام تر پیش بندیوں کے بعد بھی تقریباً چار ہزار لڑکوں کو امتحان میں ناجائز طریقے استعمال کرتے ہوئے پکڑا گیا۔

کالج آف لا کی حالت زیادہ خستہ تھی لہٰذا اصلاحات کا آغاز بھی وہیں سے ہوا۔ امتحان میں شرکت کے لیے کم از کم پچاس فیصد حاضری کو ضروری قرار دیا گیا۔ بد دماغ طلبا نے اسے قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ امتحان کے وقت پتہ چلا کہ دس فیصد طلبا بھی ۵۰ فیصد حاضری پوری نہیں کر پائے۔ وائس چانسلر نے کالج کے پرنسپل اور امتحانات کے کنٹرولر کو صورتِ حال کا جائزہ لے کر مناسب حل تلاش کرنے کی ہدایت کی۔ کنٹرولر نے ۲۰ فیصد حاضری کو معیار بنا کر امتحان کرا دیا۔ جب دوسرے کالجوں کے امتحان شروع ہوئے اور حاضری کی مقررہ فی صد پر زور دیا گیا تو طلبا بپھر گئے کہ جب ایک کالج میں بیس فی صد پر اجازت دی گئی ہے تو ہمارے لیے پچاس فی صد کی قید کیوں؟ کنٹرولر نے اعتراف کیا کہ مذکورہ کالج کے لیے ۲۰ فی صد کو ہی معیار بنایا گیا تھا تاکہ حاضری کے لزوم کا عمل شروع ہو جائے، اور اب چونکہ ایک امتحان ہو چکا ہے لہٰذا امسال تو سبھی کالجوں میں اسی معیار کو دہرانا ہوگا۔ یہ سن کر ہاشم صاحب تلملا اٹھے، انہوں نے واضح کیا کہ یونیورسٹی کے قانون میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ خلاف قاعدہ طریقہ سے اگر سند بھی عطا کردی گئی ہو تو اس کو منسوخ کیا جا سکتا ہے، یہ تو محض امتحان ہے۔ پھر ایک عدیم المثال فیصلہ صادر کرتے ہوئے حکم دیا کہ جب تک تمام طلبا باقی ماندہ حاضری کی تکمیل نہ کرلیں' امتحانات کا نتیجہ شائع نہ کیا جائے۔ ڈیڑھ دو ماہ تک اضافی کلاسیں چلیں، طلبا کو حاضر ہونا پڑا، مطلوبہ حاضری کا ہدف پورا ہو جانے پر ہی نتائج کا اعلان کیا گیا۔ اس طرح تمام طلبا برادری کو پتہ چل گیا کہ اب حاضری سے فرار ممکن نہیں ہے۔ یہ بھی طے پایا کہ کسی امتحان کا طلبا کی جانب سے بائیکاٹ ہونے پر اس کا دوبارہ انعقاد نہیں کیا جائے گا۔

ہاشم صاحب بتاتے تھے کہ حیدرآباد میں ایک اقلیتی کالج کے لیے یہ مشہور تھا کہ وہاں کے نوے فیصد لڑکے اوّل درجہ میں کامیابی حاصل کرتے ہیں، جب سخت ڈسپلن کے ساتھ امتحان کا آغاز ہوا تو پہلے دور میں یہاں ۴۵ لڑکے نقل کرتے پکڑے گئے۔ اگلے روز ایک مقامی ممبر اسمبلی کچھ طلبا کو ساتھ لے کر ہاشم صاحب سے ملنے ان کے گھر پر آئے اور فرمانے لگے، ''جناب عالی، آپ کے زمانے میں بھی اگر ہمارے بچے کاپی نہیں کر سکیں گے تو کب کریں گے؟'' ہاشم صاحب اس بے ہودہ طرز استدلال پر تلملا اُٹھے مگر انہوں نے اسی انداز میں جواب دیتے ہوئے فرمایا ''یہ کیوں نہیں سوچتے ہو کہ آپ کے بچے میرے زمانے میں بھی لائق نہیں بن سکیں گے تو کب بنیں گے''۔

اُن دنوں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی شیخ الجامعہ سیّد حامد صاحب کچھ اسی انداز میں اپنی اننگز کھیل رہے تھے، مگر علیگڑھ میں زیادہ کھل کر کھیلنا محال ہوتا ہے، کیونکہ وہاں پر یہ اصول رائج ہے کہ جہاں کسی کے مفاد حاصلہ پر ضرب پڑی، فوراً اعلان ہو جاتا ہے کہ حاکمِ وقت سے اسلام کو خطرہ ہے، اور فرزندان توحید کو یزیدی حملوں سے بچانا ملّتِ اسلامیہ کا دینی اور اخلاقی فریضہ ہے۔ ایسی حالت میں بڑے سے بڑا اولوالعزم اور پیکرِ اخلاص منتظم بھی دائیں بائیں دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اگر سید حامد صاحب کا ماضی بے داغ نہ ہوتا اور اکابر ملّت کی پشت پناہی انہیں حاصل نہ ہوتی، تو موصوف بھی فتووں کے لپیٹے میں آ سکتے تھے۔ سبھی مسلم اداروں کی آج کم و بیش یہی کہانی ہے جو پوری قوم کو دعوت فکر دے رہی ہے۔

ابھی ہاشم صاحب کو جامعۂ عثمانیہ میں ڈھائی برس ہی گزرے تھے کہ وزارت تعلیم (حکومت ہند) کی ایما پر انہیں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری قبول کرنی پڑی جہاں سید حامد صاحب کی مدّتِ کار ختم ہونے کے بعد صورتِ حال بہت مخدوش ہو چکی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان دنوں یونیورسٹی

کیمپس میں حامد صاحب کا نام لینا شامت اعمال کو دعوت دینے کے مترادف تھا، ہاشم صاحب نے عام جلسوں میں اپنے پیشرو کی بلا جھجھک پذیرائی کی اور ان کے شروع کیے ہوئے اچھے کاموں کو آگے بڑھانے کا عزم ظاہر کیا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی یقین دلایا کہ اگر ماضی میں کوئی فیصلہ غلط ہوگیا ہے یا کسی کو یہ گمان ہے کہ اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے تو اسے اپیل کرنے کا پورا اختیار حاصل ہے۔ شکایت صحیح نکلی تو تکلیف کا ازالہ کیا جائیگا۔ اُدھر علیگڑھ کی یونیورسٹی برادری بھی مسلسل مقابلہ آرائی سے عاجز آ چکی تھی، اور کچھ دن چین کا سانس لینا چاہتی تھی لہٰذا اسے بھی اسی میں عافیت نظر آئی کہ نئے انتظامیہ کے ساتھ افہام وتفہیم کی راہ اختیار کی جائے۔ اس طرح ہاشم صاحب نے جلد ہی طلبا، اساتذہ اور دیگر عملے کا اعتماد حاصل کرلیا۔ سید حامد صاحب کے ذریعہ مسطّح کی ہوئی زمین پر ہاشم صاحب آسانی سے تخم ریزی کرتے گئے، اور کم وقت میں اچھی فصل حاصل کر سکے۔ اپنے ایک انٹرویو میں ہاشم علی صاحب نے فرمایا تھا:

''میں سمجھتا ہوں کہ اچھے اڈمنسٹریٹر کا یہ بنیادی فرض ہوتا ہے کہ وہ تسلسل کو مثبت انداز میں برقرار رکھے۔ اور اس سے پہلے جو اچھے کام ہوئے ہیں ان کا اعتراف کرے۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ آنے والا، جانے والے کے اچھے کاموں میں بھی تبدیلیاں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص اپنے پیش رو کی شکایتیں کرتا رہتا ہے وہ ایک کمتر درجے کا عہدیدار ہوتا ہے۔''

طلبائے مسلم یونیورسٹی سے خطاب کرتے ہوئے ایک تقریر میں ہاشم صاحب نے فرمایا کہ امتحان میں کسی دشواری کے پیش آنے پر یا نصاب سے باہر کا سوال آجانے پر آپ لوگ امتحان کا بائیکاٹ نہ کریں بلکہ امتحان دے کر بعد میں مجھے مطلع کر دیں، اس کے لیے بھی کسی ہجوم کی ضرورت نہیں، صرف ایک مسکراتا ہوا چہرہ کافی ہے۔ امتحان کے زمانے میں کسی کلاس کے ایک طالب علم نے خارج از نصاب سوالات آجانے کی شکایت موصوف تک پہونچائی، انہوں نے فوراً کنٹرولر امتحانات کو ہدایت کردی کہ ایسے سوالات کو منہا کرکے پرچوں کی جانچ کرائی جائے۔ دو ماہ کے بعد وہی لڑکا پھر موصوف کے پاس گیا اور بتایا کہ رزلٹ آچکا ہے مگر آپ کی ہدایت پر عمل نہیں ہوا ہے۔ ہاشم صاحب نے کنٹرولر سے تفصیل مانگی تو انہوں نے غلطی کا اعتراف کیا۔ ہاشم صاحب نے حکم دیا کہ رات بھر تمام عملہ بیٹھ کر اس غلطی کی اصلاح کرے اور اگلے روز نظر ثانی شدہ نتائج کا دوبارہ اعلان کیا جائے۔

ایک مرتبہ علیگڑھ ریلوے اسٹیشن پر یونیورسٹی کے دو طلبا کو پولس نے گرفتار کرکے مار پیٹ کی، ہاشم صاحب کو اطلاع ملی تو انہوں نے فوراً ضلع کلکٹر اور ایس ایس پی کو فون کرکے طلبا کی فوری رہائی کے لیے کہا۔ مزید یہ کہ انہوں نے ان دونوں افسران کو اپنے گھر پر بلایا اور غلط فہمی کی بنا پر پیٹے گئے طلبا کو ان افسران کے سامنے پیش کیا جس پر دونوں حضرات نے اظہار تاسف کیا اور معذرت خواہ ہوئے۔ اس طرح کے واقعات سے طلبا میں یہ پیغام گیا کہ انتظامیہ انکے مفادات کی حفاظت کرتا ہے اور شیخ الجامعہ انکے ہمدرد اور خیر خواہ ہیں۔ علیگڑھ میں ایسے شیوخ الجامعہ بہت کم گزرے ہیں جن کی واپسی بھی ان کی آمد کی طرح تعظیم وتکریم کے ساتھ ہوئی ہو۔ ہاشم صاحب انہی خوش نصیبوں میں سے ایک ہیں۔ ان کے لیے کم وبیش ۷۵ الوداعی تقاریب کا اہتمام کیا گیا اور جب وہ آخری دن علیگڑھ سے دلّی ایرپورٹ کے لیے روانہ ہوئے تو بہت سے اساتذہ اور دیگر ملازمین کے علاوہ موٹر سائیکل سوار طلبا کا ایک قافلہ بھی ان کے ہمراہ تھا۔

ہاشم علی صاحب ایک بے باک اور دبنگ افسر مانے جاتے تھے اور زبان بے لگام کے لئے مشہور تھے۔ ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا، جو دل میں ہوتا تھا وہی زبان پر۔ حیدرآباد میں پولس ایکشن کے بعد جب حیدرآباد سِوِل سروس کے عہدیداروں کو انڈین اڈمنسٹریٹو سروِس کا کیڈر دیا گیا تو اس ضمن میں کسی کی مبارکباد کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ ایک برتر سروِس (HCS) سے ایک کمتر سروِس (IAS) میں شامل کیا گیا ہوں۔ سابقہ سروس میں وزارت تک ترقی کے مواقع تھے جبکہ موجودہ سروس میں پرنسپل سیکریٹری شپ آخری معراج ہے۔ اسی طرح وفاداری پر شک کرنیوالے عناصر کو انہوں نے ایک بار یہ کہہ کر لتاڑا تھا کہ تم تو اتفاقیہ (by chance) ہندوستانی ہو، ہم اپنی پسند سے (by choice) ہندوستانی ہیں۔ ہاشم صاحب کے کالج کے ساتھی جناب حسن الدین احمد تحریر فرماتے ہیں کہ ''میں محبوب نگر میں بحیثیت جوائنٹ کلکٹر کام کر رہا تھا۔ چیف سیکریٹری نے جناب اسداللہ سعید کو بحیثیت کلکٹر وہاں تعینات کرنے کی تحریک کی۔ فائل گورنر صاحب (بھیم سین سچر) کے سامنے آئی تو انہوں نے اس طرف اشارہ کیا کہ ایک ہی ضلع میں اعلیٰ ترین عہدوں پر دو ہم مذہب افسروں کی تعیناتی غیر مناسب تو نہ ہوگی، ان کے سیکرٹیری (جناب ہاشم علی) نے فوراً جواب دیا کہ باقی تمام اضلاع میں بھی تو ایسا ہی ہے، سچّر صاحب نے بات کی گہرائی کو سمجھتے ہوئے فوراً فائل پر دستخط کر دیے۔

مختلف اضلاع میں تعیناتی کے دوران ہاشم صاحب اس بات سے نالاں رہتے تھے کہ منسٹر حضرات اضلاع کے دورے پر آتے تو عوامی تقریروں یا ملاقاتوں میں ضلع حکام کو زبانی طور پر کئی ایسے احکامات دے جاتے تھے جو تکنیکی اعتبار سے ناقابل عمل اور ضلع حکام کے اختیارات سے باہر ہوتے تھے، عدم تعمیل کی صورت میں عوام میں حکام کی شبیہ خراب ہوتی تھی، ایک مرتبہ جب ہاشم صاحب کتہ گوڑم میں ڈپٹی کلکٹر تھے، ریاست کے ایک وزیر انکے علاقے میں تشریف لائے۔ ایک تقریر کے دوران وزیر موصوف نے ضلع انتظامیہ کو کچھ مشورے دے ڈالے۔ ہاشم صاحب نے ان تمام احکامات کو ہاتھ کے ہاتھ اسٹینو ٹائپسٹ سے ٹائپ کرا کے تقریر ختم ہوتے ہی کاغذات دستخط کے لیے وزیر موصوف کے سامنے رکھ دیئے تاکہ فوری احکامات جاری کر سکیں۔ منسٹر صاحب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور پھر وہ زبانی احکامات سے گریز کرنے لگے۔

علیگڑھ میں ایک بار کسی کونسل کی میٹنگ میں اساتذہ کی شدید مخالفت اور ڈسپلن شکنی کا ذکر کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ خدا جانے یہاں کے اساتذہ کو کون سی بیماری لگ گئی ہے، کچھ لوگ تو کتّوں کی بولی بولنے لگے ہیں''۔ ہاشم علی صاحب وائس چانسلر کے وقار منصبی کا پورا خیال رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ موصوف کو علی گڑھ آئے ہوئے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے، فیکلٹی آف آرٹس میں کوئی فنکشن تھا اور دلی سے کسی وزیر کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے آنا تھا۔ جب وزیر موصوف یونیورسٹی سے متصل ہائڈل گیسٹ ہاؤس آپہنچے تو شیخ الجامعہ کو اطلاع کردی گئی کہ مہمان خصوصی کچھ دیر بعد آنے والے ہیں، اب آپ بھی تشریف لے آئیں۔ ہاشم صاحب فوراً جائے تقریب پر پہنچ گئے۔ اُدھر وزیر موصوف سیاسی نیتاؤں اور پارٹی ورکروں سے ملاقاتوں میں اُلجھ گئے۔ بار بار فون کرنے پر یہی جواب ملتا تھا کہ منتری جی کچھ پرمُکھ نیتاؤں سے وارتالاپ کر رہے ہیں، تھوڑے سمے کے بعد آپ کی سبھا میں درشن دیں گے۔ انتظار کا عرصہ طویل ہوتا گیا تو ہاشم صاحب یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے کہ شیخ الجامعہ کو اس طرح باندھ کر نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ تقریب کے ذمہ داران نے لاکھ سمجھایا کہ منتری جی بس آیا ہی چاہتے ہیں لیکن ہاشم صاحب نے قصدِ روانگی ترک نہ کیا۔ بعد میں وزیر موصوف کے آجانے کے بعد ہی وہ دوبارہ تشریف لائے۔

ہاشم صاحب کی حِس مزاح بھی بہت عمیق اور لطیف تھی اور فقرے چپکانے میں انہیں امتیاز حاصل تھا۔ ایک دینی جماعت سے منسلک حضرات کے لباس کا تذکرہ غالبًا ان سے بہتر کسی نے بھی نہ کیا ہوگا۔ ان کا یہ جملہ کہ فلاں صاحب کو دیکھ کر ایسا لگا کہ شاید بڑے بھائی کا کرتا اور چھوٹے بھائی کا پاجامہ پہن کر چلے آئے ہیں، علیگڑھ میں آج تک مشہور ہے۔ ایک بار شعبۂ دینیات کے دونوں (سنّی اور شیعہ) صدور کو بلا کر ہاشم صاحب نے بتایا کہ میں نے کل آپ کے شعبے کا دورہ کیا مگر وہاں نہ کسی طالب علم کو پایا نہ استاد کو۔ جواب ملا ''جناب لڑکے آتے ہی نہیں ہیں''۔ دریافت کیا ''پھر حاضری کیسے ہوتی ہے؟'' جواب ملا ''حاضری تو دینی ہی پڑتی ہے''۔ ہاشم صاحب بولے ''مولانا، آپ لوگوں کے ذہنوں میں دینیات تو ہے، مگر دلوں میں دین نہیں ہے''۔ موصوف کا یہ قول بھی کیمپس میں بڑا مشہور ہوا۔

ایک دن چاپلوس قسم کے چند طلبا وی سی لاج پہونچے اور ہاشم صاحب سے کہا کہ مسجد میں فلاں مولوی نے آپ کو کافر گردانا ہے اور یہ ہماری برداشت سے باہر ہے۔ جواب میں ہاشم صاحب نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے فرمایا'' یا اللہ، تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہاں مجھے ایک ہی سال میں کافر کہا جانے لگا اور وہی سلوک ہونے لگا جو سرسید علیہ الرحمہ کے

ساتھ ہوا تھا۔ اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ میں صحیح راستے پر ہوں''۔ ایک مرتبہ کسی ڈائننگ ہال میں دال میں جھینگر نکل آیا تو طلبا کی ایک ٹولی دال کا پیالہ ہاتھ میں لیے وی سی لاج پہونچ گئی، متعلقہ وارڈن اور پرووسٹ وغیرہ کو ضروری تاکید وتنبیہ کے بعد ہاشم صاحب آنے والے طلبا سے ان کی کلاس معلوم کرنے لگے، کسی نے 'ایم بی بی ایس' بتایا تو کسی نے 'پی ایچ ڈی'، کوئی 'ایل ایل بی' کا طالب علم تھا تو کوئی 'ایم ایس سی' کا۔ یہ سب سن کر ہاشم صاحب بولے ''کیسا خوش نصیب جھینگر ہے، جس کے جنازے میں اتنے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ شریک ہیں''۔

یوم سرسید کے موقع پر ڈاکٹر فاروق عبد اللہ نے تقریر شروع کی تو کچھ طلبا نے منہ نیچا کرکے اجتماعی طور پر ''سی.....سی......'' جیسی آواز نکالنا شروع کردی۔ ہاشم صاحب بڑے سکون سے اٹھے اور مائیک پر آکر بولے کہ سرسیدؒ نے جو اعتماد مسلمانوں میں پیدا کیا تھا آج وہ پنکچر ہو رہا ہے۔ یہ جملہ مؤثر ثابت ہوا اور متعلقہ طلبا کھسیانے ہوکر خاموش ہوگئے۔ جب ایک پروفیسر نے ہاشم صاحب کو آگاہ کرتے ہوئے بتلایا ''صاحب' علیگڑھ میں وائس چانسلر کا استقبال تو ہوتا ہے مگر وداعیہ نہیں ہوتا''، تو ہاشم صاحب نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا 'اچھا، تو شریفوں کی اتنی کمی ہے یہاں؟'' اسی طرح جب ایک پروفیسر نے ذرا خوف دلاتے ہوئے انکو بتایا کہ جناب والا۔ یہاں وائس چانسلر کو آخری سال میں بہت پریشان کیا جاتا ہے، تو ہاشم صاحب نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا، ''میں نے پہلے ہی سال میں گیارہ لوگوں کو معطل کیا ہے تو آخری سال میں کیا عالم ہوگا؟''

ہاشم صاحب کے جملوں میں ادب کی چاشنی بھی ہوتی تھی اور طنز کی چبھن بھی۔ اپنے ایک دوست افسانہ نگار قدیر زماں صاحب کی شریک حیات کے انتقال کی خبر پاکر تعزیتی خط (۳۱ر اگست ۲۰۰۲ء) میں لکھتے ہیں۔ ''خدا آپ کو صبر دے اور آپ کے بچوں کو یہ احساس دے کہ اب تک ان کو آپ کی ضرورت تھی، اب آپ کو ان کی ضرورت ہے''۔ جب ہاشم علی صاحب شکاگو (امریکہ) کے ایک اسپتال میں آخری بار داخل ہوئے تو ان کے دوست سید نظام الدین نصیران سے ملنے اسپتال جایا کرتے تھے، ایک بار وہ گئے تو ہاشم صاحب کو سوتا ہوا دیکھ کر واپس آگئے۔ بعد میں ہاشم صاحب کو ان کی آمد کا علم ہوا تو فون پر فرمایا'' آپ آتے ہیں اور مجھے جگائے بغیر چلے جاتے ہیں۔ مجھے اٹھاتے، بلاتے تو اچھا ہوتا، سوئی ہوئی قوم کے ایک فرد کو جگانے کا ثواب تو مل جاتا آپ کو''۔

علیگڑھ میں ہاشم صاحب کا زمانہ نسبتاً پرسکون رہا، لیکن ہاشمی دور کا یہ سکون بڑی حد تک ان کے پیش رو سید حامد صاحب کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ حامد صاحب کے بارے میں علی گڑھ میں یہ مشہور تھا کہ سینئر کے وجود سے ان کو اللہ واسطے کا بیر ہے۔ انھوں نے ہر سینئر کی گردن پر ہاتھ ڈالا خواہ اس کا تعلق اساتذہ سے ہو یا غیر تدریسی عملے سے، طلبا سے ہو یا ریسرچ اسکالر سے، یہاں تک کہ آرٹس فیکلٹی کے برابر میں اور مولانا آزاد لائبریری کے سامنے سینکڑوں برس سے قائم برگد کے اس سینئر درخت کو بھی تہہ تیغ کر ڈالا جس کے سایہ تلے کبھی ایک قد آور لیٹر بکس نصب ہوتا تھا۔ چوں کہ حامد صاحب اپنے ''صفائی ابھیان'' کے تحت یونیورسٹی کیمپس کے کم وبیش سبھی شہ زوروں سے پنجہ آزمائی کرکے ان کی سانس اکھاڑ چکے تھے۔ لہٰذا حامد صاحب کی واپسی کے بعد خودسری کے آثار کافی عرصہ تک معدوم رہے اور سید ہاشم علی جیسے تجربہ کار منتظم نے، جو جامعہ عثمانیہ کے بگڑے تیوروں کو درست کرنے کے بعد سرزمین علی گڑھ پر قدم رنجہ ہوئے تھے، اس ماحول سے پورا فائدہ اٹھایا اور یونیورسٹی کے علمی و تحقیقی پروگراموں کو صحیح سمت عطا کی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ہاشم صاحب کے دور اقتدار میں محض دو معاملات نے طول پکڑا تھا۔ ایک تو وہی باٹنی ڈیپارٹمنٹ والا قضیہ جس کی اساس دور حامدی میں ہی پڑ چکی تھی، اور دوسرا انجینئرنگ کالج کی کچھ کلاسوں کو پالی ٹیکنک سے ملحق کردینے پر پیدا شدہ خلفشار، اس کے علاوہ پورے عرصہ تقریباً خیروعافیت ہی رہی، ویسے چھوٹی موٹی اٹھا پٹخ تو بڑے اداروں میں روزمرّہ کا معمول ہوتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ہاشم صاحب اپنے دور منصبی کے آخری دن تک ایک فعال شیخ الجامعہ رہے۔ چلتے چلتے بھی وہ ایک معروف پروفیسر کو معطل کرگئے، ایک ایسے پروفیسر کو جو عرصۂ دراز تک ان کے مصاحب خاص رہے تھے اور ماہر امراض قلب ہونے کی حیثیت سے دوران علالت انکی دیکھ بھال کے لیے امریکہ تک ساتھ گئے تھے۔

اپنے دور اقتدار کے آخری ایام میں ایک بار ہاشم صاحب کو چانسلر (جناب اخلاق الرحمان قدوائی) سے پنجہ آزمائی کرنا پڑی۔ مجلس عاملہ نے نیا وائس چانسلر منتخب کرنے کے لیے حسب ضابطہ پانچ ناموں کا پینل کورٹ کو بھیجا۔ یونیورسٹی کورٹ اگر چاہے تو اس لِسٹ میں سے ایک یا دو نام حذف کرسکتا ہے اور بقیہ ناموں کو صدر جمہوریہ کی خدمت میں ارسال کیا جاتا ہے' تاکہ وہ یونیورسٹی کے وزیٹر کی حیثیت سے ان میں سے کسی ایک کو وائس چانسلر منتخب کرسکے۔ مذکورہ پینل میں حیدرآباد کے خالد انصاری صاحب کا نام بھی شامل تھا۔ کورٹ کو اطلاع ملی کہ انصاری صاحب نہیں چاہتے کہ ان کے نام کو زیرغور لایا جائے۔ اس اطلاع کی بنیاد پر چانسلر (کورٹ کی میٹنگ کے صدر نشین) نے پینل کو نامکمل قرار دیتے ہوئے واپس مجلس عاملہ کو بھیجنے کی بات کہی۔ ہاشم صاحب کا موقف یہ تھا کہ پینل کو واپس کرنے کا اختیار صرف وزیٹر (صدر جمہوریہ ہند) کو حاصل ہے، بہرحال چانسلر نے ووٹنگ کراکے اک معمولی اکثریت سے یہ فیصلہ کردیا کہ مجلس عاملہ کو دوبارہ پینل بنانے کو کہا جائے۔ ہاشم صاحب نے خود کو اس فیصلے سے الگ کرلیا اور بعد میں قانونی صلاح لے کر شیخ الجامعہ کے خصوصی اختیار کے تحت کورٹ کے اس فیصلے کو منسوخ کردیا، اور حکومت ہند کو اطلاع بھیج دی۔ یہ ایک انتہائی غیر معمولی قدم تھا جو ہاشم صاحب کی آمرانہ جسارت کو درشاتا ہے۔ ان کے اس عمل نے دستوری پیچیدگی پیدا کردی، یہ بات کہی گئی کہ کورٹ مقتدر اعلیٰ ہے جس کے فیصلے کو ماننے کے لیے وائس چانسلر پابند ہے۔ ہاشم صاحب تو کچھ عرصہ بعد نائب شیخ الجامعہ پروفیسر وصی الرحمان صاحب کو زمام اقتدار سونپ کر واپس حیدرآباد چلے گئے مگر حکومت ہند کا ردّعمل موصول ہونے میں اور مجلس عاملہ کی اگلی میٹنگ کرانے میں تقریباً دو برس لگے۔ جب نیا پینل مرتب کرکے دوبارہ کورٹ کو بھیجا گیا تب اگلے شیخ الجامعہ کے طور پر پروفیسر نسیم فاروقی صاحب کا انتخاب عمل میں آیا۔

۱۹۹۰ء میں جب میری پہلی کتاب منظر عام پر آئی تو میں پروفیسر کی حیثیت سے جامعہ ہمدرد آچکا تھا۔ میں نے حیدرآباد کے پتے پر ہاشم علی صاحب کو اطلاع دی کہ جس کتاب کی تیاری کے لیے آپ نے تین سال پہلے دس ہزار روپے کی رقم منظور فرمائی تھی وہ انگلینڈ کے ایک مشہور پبلشر کے توسط سے چھپ گئی ہے۔ یہ بھی بتایا کہ منظور شدہ رقم کی ادائیگی کو یونیورسٹی کے متعلقہ دفتر نے برسوں ملتوی رکھا اور پھر اس بنا پر منسوخ کردیا کہ میں اب (۱۹۹۰ء میں) دو برس کی چھٹی پر جامعہ ہمدرد آگیا ہوں۔ ہاشم صاحب نے خفگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب میں لکھا ''کاش میری موجودگی میں ایسا ہوا ہوتا''

ہاشم صاحب قومی یک جہتی کے زبردست علم بردار تھے۔ جب وہ علیگڑھ میں تھے تو انہوں نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اور بنارس ہندو یونیورسٹی کے درمیان کھیل کود اور تعلیم وتحقیق کی سطحوں پر زبردست تال میل پیدا کیا تھا۔ حیدرآباد واپسی کے بعد وہ پوری طرح سے ادبی، ملّی اور مذہبی خدمات میں منہمک ہوگئے۔ ۱۹۹۳ء میں انہوں نے سابق ڈپٹی گورنر، ریزرو بینک آف انڈیا، جناب ایم راما کرشنیّا کے ساتھ مل کر ''ہم سب ہندوستانی'' نام کی سوسائٹی تشکیل کی جس کا نصب العین ''عمل باہمی کے ذریعہ یک جہتی'' تھا۔ بعد میں اس کو ایک ٹرسٹ کی شکل دیدی گئی۔ اسی دوران (اپریل ۱۹۹۳ء میں) وزیر اعظم ہند نے گورنر آف کشمیر کے مشیر کی حیثیت سے ہاشم صاحب کا تقرر کرنا چاہا مگر انہوں نے معذرت کرلی۔

نومبر ۱۹۹۳ء میں اچانک بیگم وحید ہاشم صاحبہ اس جہانِ فانی سے رحلت فرماگئیں اور ہاشم صاحب زندگی کے سفر میں تنہا رہ گئے۔ چونکہ دونوں بیٹیاں اور فرزند ارجمند امریکہ میں سکونت پذیر تھے، بادل نخواستہ ہاشم صاحب کو بھی امریکہ کے لیے ہجرت اختیار کرنی پڑی۔ دھیرے دھیرے صحت گرتی گئی مگر ذوق مطالعہ بڑھتا گیا۔ وہ اپنے سینے میں بڑا دردمند دل رکھتے تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی زبوں حالی، معاشی اور تعلیمی پسماندگی، اور مسلکی انتہاپسندی پر ہمیشہ کف افسوس ملتے رہے اور جاہل ملاّؤں کی قیادت پر لعنت بھیجتے رہے۔ ۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کو بنیاد بنا کر عالمی پیمانے پر مسلمانوں کو دہشت گردی سے جوڑنے کی جو مہم چلائی گئی اور اس کے نتیجے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوئیں ان سے موصوف بہت مضطرب رہنے لگے تھے۔ امریکہ میں

ہونے والی بین مذاہب کانفرنس میں وہ بہت فعّال رہے۔ پارلیامنٹ آف ورلڈز ریلیجنس میں اسلام کی نمائندگی کی۔ اسلام کی ماہیت (Essence of Islam) نامی کتاب لکھ کر غیر مسلموں میں اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے کی کوشش کی۔ شکاگو کے اسلامی مراکز میں پابندی کے ساتھ موصوف کی تقریریں ہونے لگیں۔ اسلام کی ماہیت اور مسلمانوں کے حالیہ مسائل پر ان کے پرمغز اور مدلّل مضامین وقتاً فوقتاً منظر عام پر آتے رہے۔

ہاشم علی صاحب کے دل میں چھپے بے پناہ کرب کا احساس کہیں کہیں ان کے خطوط میں نظر آتا ہے۔ معروف قلم کار جناب گیان سنگھ شاطر کو امریکہ سے بھیجے گئے ایک خط (مورخہ ۱۶ نومبر ۱۹۹۸ء) میں انہوں نے اپنی مایوسی اور بے دلی کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا:

"کبھی کبھی خیال کرتا ہوں کہ میرا مقام کیا ہے؟ جس ملک میں پیدا ہوا اور جس کی ۴۵ برس خلوص دل اور سخت محنت سے خدمت کی، وہاں ایک مشتبہ فرقے کا فرد سمجھا جاتا ہوں۔ پاکستان جاتا تو مہاجر کہلاتا، بنگلہ دیش میں بہاری ہوتا۔ عرب ممالک میں غیر عرب ہوتا اور گوروں کے ملکوں میں رنگ دار اجنبی نظر آتا۔ میری بے تعصّبی کے باوجود ہر جگہ تعصّب کا شکار رہتا۔ جہاں جہاں کام کیا، کچھ نہ کچھ ترقی دی اور چیزوں کو بہتر بنانے کی کوشش کی، حالانکہ ہر جانشین نے پھر اسے واپس پرانی حالت پر جانے کی سہولت فراہم کی۔ ترک وطن کے بعد اب صرف ایک بال پوائنٹ پین کا مالک ہوں، مگر اس قلم سے کوئی ایسی تحریر بھی تو نہیں چھوڑی جو کچھ دن زندہ رہتی۔"

ہاشم صاحب کے امریکہ منتقل ہوجانے کے بعد مدّت مدید تک احقر کا ان سے رابطہ منقطع رہا۔ ۲۰۰۰ء میں ماہنامہ تہذیب الاخلاق (علی گڑھ) کے ایک شمارے میں موصوف کی علالت کی خبر اور ان کے ایک خط کا اقتباس پڑھ کر آنکھیں بھر آئیں، میں نے ایک عیادتی خط ارسال کیا تو سلسلۂ جنبانی پھر قائم ہوگیا۔ افسوس کہ ان کے متعدد خطوط میں سے محض چند ہی آج میرے پاس محفوظ ہیں۔ زیادہ تر پیغامات جو بذریعہ ای میل موصول ہوتے تھے اب دستیاب نہیں ہیں۔ ۱۸ دسمبر ۲۰۰۲ء کے ایک خط میں راقم کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اور اپنی صحت اور مصروفیات کا تذکرہ کرتے ہوئے موصوف یوں فرماتے ہیں:

'......چند دن پہلے یہاں کے ایک ہندوستانی انگلش اخبار میں آپ کو ایوارڈ ملنے کی خبر پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ اگر ہم پُر خلوص کام کریں تو دیر سے سہی اس کی قدر ہوتی ہے۔ ہم میں سے اکثر لوگ خیالی دشمنوں میں گھرے ہوتے ہیں اور اپنے غیر معیاری کام پر نظر ڈالنے کے بجائے ناانصافیوں اور دشمنیوں کا رونا روتے رہتے ہیں۔ یہاں امریکہ میں بھی ہمارے ہم وطن ہر میدان میں ہم سے آگے ہیں۔......ستمبر میں پھر ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ کوئی بیس دن ہسپتال میں گزارے اور ۳۵ دن روزانہ ایکسٹرنل کاؤنٹر پلسیشن سے علاج کے لیے ہسپتال جاتا رہا۔ اب اللہ کے فضل سے ٹھیک ہوں۔...... ایک اردو کتاب "ہندوستانی مسلمان منزل کی تلاش میں" مکتبۂ شعر و حکمت، حیدرآباد کی طرف سے ایک دو مہینے میں شائع ہونے کی امید ہے۔ اس میں میرے مضامین اور مجھ پر لکھے ہوئے مضامین شامل ہیں۔ ......میں اپنی کتاب (Essence of Islam) کے دوسرے اڈیشن کے لیے کچھ اضافے تحریر کررہا ہوں۔ ایک اضافہ تکثیریت اور بین مذاہب امن و آشتی (Pluralism and peace between Religions) کے بارے میں ہے۔ اس موضوع پر شاید سوائے مولانا آزاد اور ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحبان کے اور لوگوں نے بہت کم توجہ کی ہے۔"

ہاشم صاحب اردو کے محض طالب علم یا پرستار ہی نہیں تھے بلکہ ایک مایۂ ناز قلم کار و ادیب بھی تھے۔ اسلام میں ربا اور سود کے موضوع پر آپ کے مضامین بہت مقبول ہوئے۔ ان کا مقالہ "اردو کی بقا، ترویج اور ترقی کے مسائل" جو ایک سیمینار میں کلیدی خطبے کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا، بعد میں ہفت روزہ "ہماری زبان" میں شائع ہوا اور بہت پسند کیا گیا۔ سرکاری ملازمت کے دوران بھی "قومی یک جہتی، ایک قومی ضرورت" کے عنوان سے ان کی ایک کتاب ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ جون ۱۹۷۵ء میں انہوں نے حیدرآباد میں "ادارۂ ادبیات اردو" کی اعزازی معتمدی قبول کی اور آخر تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔ جہانِ اردو فاؤنڈیشن، شکاگو، نے "دی عثمانین۔ یو ایس اے" کے اشتراک سے ۲۰۰۳ء میں، انتظامیہ، تعلیم اور اردو ادب میں نمایاں خدمات کیلئے ہاشم صاحب کو "امتیاز دکن" کا خصوصی اعزاز عطا کیا۔ اردو میں اور اردو کے بارے میں لکھے گئے ان کے مضامین اور خطبات کی فہرست خاصی طویل ہے۔

اردو کی ترویج و ترقی کے لیے وہ اس زبان کو ایک سے زیادہ رسم الخط میں لکھنے کے حامی تھے۔ ایک بار شکاگو (امریکہ) کے ایک جلسے کی صدارت کرتے ہوئے ہاشم صاحب نے فرمایا تھا کہ آزادیِ وطن کے بعد ہندوستان میں اردو لکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد روز بروز گھٹتی جارہی ہے جب کہ اردو بولنے والوں کی تعداد مسلسل بڑھ رہی ہے۔ گویا اردو اب 'آنکھوں کی زبان' نہ رہ کر محض 'کانوں کی زبان' بن گئی ہے۔ ہندوستان میں آج اردو کی بقا کا مسئلہ ہے جب کہ مغرب میں اردو کی ترویج کا۔ باوجودیکہ اردو کا موجودہ رسم الخط اپنی فراخ دامنی، مختصر وجودی اور ہمہ صوتی جیسی خصوصیات کے اعتبار سے دوسروں سے زیادہ خوب رو اور خوش صفت ہے؛ اردو کو اگر زندہ رکھنا ہے اور ترقی دینا ہے تو ہمیں اردو کے لیے اضافی رسم خط اپنانے ہوں گے۔ فارسی رسم خط کے علاوہ ہندوستان میں دیوناگری اور مغرب میں رومن رسم الخط میں بھی لکھنا اور چھاپنا ہوگا۔ انکا خیال تھا کہ چونکہ اردو زبان میں سب سے زیادہ آمیزش ہندی اور فارسی کی ہے اور یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے سات سو سالہ امتزاج کا نتیجہ ہے لہٰذا اس کو برقرار رکھنے اور مستقبل میں قومی یک جہتی کا ایک ذریعہ بنانے کے لیے اردو کو فارسی اور دیوناگری دونوں رسوم خط میں لکھنا پڑھنا مفید ہوگا۔ کچھ اسی طرح کے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے سید حامد صاحب فرماتے تھے کہ ہندوستان میں اردو کا مسئلہ محض رسم خط کا ہی مسئلہ ہے، رسم خط چلا گیا تو اردو زبان، زبان نہ رہ کر محض ایک بولی رہ جائے گی جو 'عام ہندی' کہلائے گی۔ رسم خط جاتے ہی اردو ادب کی لطافت، معنویت اور شیرینی بھی رخت سفر باندھ لے گی، لہٰذا اردو کے موجودہ رسم خط کو برقرار رکھنا ضروری ہے لیکن اردو مطبوعات کو دیوناگری میں بھی چھاپنے کا اہتمام کرنا چاہیئے تاکہ ہندی کے قارئین بھی اردو ادب کی چاشنی سے محروم نہ رہیں۔

دراصل اردو زبان کی شیرینی اور فصاحت کا اعتراف وہ لوگ بھی کرتے ہیں جنکی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ اسکی ایک وجہ اگر اردو الفاظ کی وسیع معنویت ہے تو دوسری وجہ تلفظ کی خوبصورتی ہے۔ الفاظ کی ادائیگی کا حسن بڑی حد تک اسکے املا پر منحصر ہوتا ہے۔ تقریباً یکساں صوتی کیفیت کو ظاہر کرنے والے متعدد حروف کی موجودگی اور مختلف الفاظ میں انکا مخصوص استعمال اردو املا کی منفرد خوبی ہے۔ مثال کے طور پر 'ت' اور 'ط' صوتی اعتبار سے یکساں ہیں تاہم آپ 'غلط' کو 'غلت' یا 'عادت' کو 'عادط' نہیں لکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح 'ث'، 'س' اور 'ص' اردو میں ایک سی ہی آواز نکالتے ہیں لیکن 'وارث' کو 'وارس'، 'مقصد' کو 'مقسد' یا 'آسان' کو 'آصان' نہیں لکھا جا سکتا ہے۔ املا کے اسی قید و بند نے نہ صرف اردو کے رسم خط کو انفرادیت بخشی ہے بلکہ اسکے حسن کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ رسم خط بدلا تو اردو کی یہ انفرادیت اور دلکشی بھی جاتی رہے گی۔ اردو کے تلفظ میں پائی جانے والی بوقلمونی کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ اردو کا واقف کار دوسری زبان والوں کی بہ نسبت انگریزی جیسی دیگر زبانیں بھی عام طور پر زیادہ خوش اسلوبی اور صحت الفاظی کے ساتھ بول لیتا ہے۔

یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ وقت کی روانی کے ساتھ زبانوں کے ارتقا کا عمل جاری رہتا ہے' لہٰذا کبھی ایک زبان کے الفاظ من وعن یا کچھ بدلی ہوئی شکل میں دوسری زبان کا حصہ بن جاتے ہیں تو کبھی زبان کے خود اپنے الفاظ کی ہیئت میں تبدیلی آجاتی ہے اور املا بدل جاتا ہے۔ انگریزی الفاظ کی جب نئی امریکی ہجّے سامنے آئیں تو ابتدا میں سخت ناگواری کا احساس ہوا' لیکن دھیرے دھیرے ذہن مانوس ہوتا گیا اور آج ہمیں programme کو program، colour کو

color اور honour کو honor لکھنے میں کوئی تامّل نہیں ہوتا ہے (یہ الگ بات ہے کہ through کو thru لکھنا مجھے آج بھی گوارا نہیں ہے)۔ عصرِ حاضر میں اردو املا میں بھی کئی تبدیلیاں آئی ہیں اور آج ہم بخوشی ماضی کے 'علیحدہ' کو 'علاحدہ' 'بین الاقوامی' کو 'بین اقوامی' یا 'رسم الخط' کو 'رسم خط' لکھنے لگے ہیں۔ برسہا برس سے چلے آرہے 'متنازعہ' کو ہم نے حال ہی میں 'متنازع' لکھنا شروع کیا ہے۔ بہرحال حسن و قبح اپنی جگہ' اردو الفاظ کی دلکشی بڑی حد تک رسم خط اور تلفّظ سے ہی وابستہ ہے۔

اردو رسم خط کی کچھ خامیاں بھی ہیں جو اعراب کے مکمل ترک استعمال کی پیدا کردہ ہیں۔ ہندی رسم خط میں ماتراؤں کی مدد سے عبارت کی گرہیں خود بخود کھلتی چلی جاتی ہیں جبکہ اردو رسم خط میں اعراب کی عدم موجودگی کے باعث دماغ کا استعمال ضروری ہوجاتا ہے۔ جسے زبان پر عبور نہ ہو یا سیاق وسباق کا علم نہ ہو' وہ اردو پڑھتے ہوئے تلفظ کے اعتبار سے بڑی خوبصورت حماقتیں کرسکتا ہے کیونکہ الفاظ کی ہجّے صحیح تلفّظ کی جانب خود بخود اسکی رہ نمائی نہیں کرپاتی ہیں۔ اردو کا طالب علم اگر تلفّظ کے اعتبار سے 'شور' کو 'نور'۔ 'چوٹ' کو 'لوٹ'۔ 'سفر' کو 'صبر'۔ 'طِفل' کو 'جبَل'۔ 'غزوَہ' کو 'گروہ'۔ 'زیست' کو 'زینت'۔ 'منور' کو 'تنور'۔ 'ابیَض' کو 'انیس'۔ 'سرخ' کو 'نرخ' یا 'طفیل' کو 'کفیل' کے وزن پر پڑھتا ہے تو اسمیں اس غریب کا کیا قصور ہے؟ اسی طرح 'بالکل' بالواسطہ' اور 'فی الفور' جیسے الفاظ میں الف کے ساکن ہونے کا علم نہ ہو تو تلفّظ کہیں کا کہیں جا سکتا ہے۔ 'مقلد' 'ملوث' مذکر' 'مقدس' 'تمدن' اور 'تشکر' جیسے الفاظ بنا تشدید کے لکھنے پر انتہائی مضحکہ خیز تلفّظ کو راہ دے سکتے ہیں۔ میں خود لڑکپن میں عرصۂ دراز تک 'متموّل' کو 'مت مؤل' اور 'متوسّط' کو 'مت وسط' پڑھا کرتا تھا۔ کئی پڑھے لکھے لوگ بھی 'جدوجہد'۔ 'من وعن'۔ 'جزبز'۔ معتد بہٗ' اور 'کماحقہٗ' جیسے الفاظ کو غلط تلفّظ کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اردو میں اعراب کے استعمال کو معیوب نہ سمجھا جائے بلکہ مذکورہ بالا قسم کے مخصوص الفاظ کے لیے اعراب کا استعمال ضروری خیال کیا جائے؟

جون کا مہینہ آتا ہے تو ہاشم صاحب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ یقین کامل ہے کہ موصوف بڑی عیش کی گزار رہے ہوں گے، ایسے ہی لوگوں کے لیے تو جنت کی بشارت ہے جنکی ذات اس دنیا میں خلق خدا کے لیے فیض کا مبدا بنی ہو۔ حیدرآباد کی مٹی اس لحاظ سے بڑی زرخیز ثابت ہوئی کہ اس نے آزاد ہندوستان کو پروفیسر رشید الدین خاں، پروفیسر جعفر نظام، پروفیسر علی محمد خسرو، پروفیسر بشیر الدین خاں، جناب سید ہاشم علی اختر اور جناب عابد حسین جیسے بلند پایہ مسلم دانشور اور ماہرین تعلیم عطا کیے جن کا ذکر آجانے پر کسی بھی ہندوستانی کو، اور بالخصوص ہندوستانی مسلمان کو فخر کا احساس ہونا لازم ہے۔

***

”مقاماتِ دل“

ازشاہ حسن عطا (علیگ)، مرتبہٗ شاہ عمر عطا

یونین کے جو بڑے صدر ہوئے، ان میں ڈاکٹر ذاکر حسین بھی تھے، ان کا ذکر خیر تفصیل سے آچکا، اور اس طرح آیا کہ ان کی تحریروں کا ایک خوبصورت انتخاب پیش کیا گیا۔ آزادی کے بعد جو بڑے صدر ہوئے جنہیں علی گڑھ اپنے لیجینڈس میں شمار کرتا ہے، ان میں بلبلیا (جنوبی افریقہ)، سلطان نیازی (کانپور)، شاہ حسن عطا (سلون)، عنایت آفتاب (بھاگلپور)، احمد سعید (کانپور)، عابداللہ غازی (دیوبند) کو لوگ اب تک یاد کرتے ہیں۔

شاہ عمر عطا (لندن) نے اپنے پیارے باپ کے نام کو بڑی شائستگی سے زندہ رکھا ہے، اور ان کی تحریروں کا ایک مجموعہ ”مقاماتِ دل“ کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ اس میں سراسر علی گڑھ ہی ہے۔ فرزند ارجمند عطا عمر صاحب نے یہ مجموعہ مرتب کر کے علیگ برادری پر بڑا احسان کیا ہے۔ ”مقامات دل“ کے علی گڑھ سلسلے کے مشتملات کی فہرست یہ ہے:

سرسید • لیاقت علی خاں • مولانا محمد علی • جسٹس سید محمود • نواب اسمٰعیل • رشید احمد صدیقی • پروفیسر عمر الدین • پروفیسر مجید الدین • ذکر علی گڑھ • ذاکر علی خاں • قمر السلام خاں • الطاف علی بریلوی۔

ان مضامین میں فلسفہ والے عمر الدین صاحب کو لوگ زیادہ دلچسپی سے پڑھیں گے۔ ان کے بیٹے بھی ان سے کم نہیں تھے، نام صلاح الدین محمود تھا، ”سویرا“ میں ایک یادرہ جانے والا مضمون لکھ گئے۔ باپ پروفیسر عمر الدین ہمیشہ کے لئے علی گڑھ کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر رہ گئے، مگر عمر الدین صاحب کا مضمون سرسید کے مذہبی فکر پر اتنا بڑا مضمون ہے جتنا اعلیٰ مضمون بیٹے نے لکھا۔ بیٹے کا مضمون دل سے لکھا گیا تھا، بلکہ خون دل سے؛ اور عمر الدین صاحب کا مضمون سرسید کے مذہبی فکر کو سمجھنے کے لئے حرف آخر کا درجہ رکھتا ہے۔

شاہ حسن عطا کی تصنیفات کی فہرست:

• ہماری یونین: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مشہور زمانہ طلبہ یونین کی مختصر تاریخ • مبادیات مدنیت، دو جلد، شریک مصنف • حریر سنگ، شعری مجموعہ • حضرت ابوبکر صدیقؓ و حضرت فاروق اعظمؓ (مصنف ڈاکٹر طہٰ حسین، عربی سے ترجمہ) • سیاست نامہ، (مصنف: خواجہ نظام الملک طوسی، فارسی سے ترجمہ • صنم خانہ عشق، از امیر مینائی (تصحیح و تحقیق) • افصح العرب والعجم، (آنحضرت ﷺ کے چند خطبات پیش بہا، ان کے تراجم اور حواشی پر مشتمل) • Facts of Islamic Ideology • روزگار فقیر (مصنف سید وحید الدین، ترجمہ) • فضائل ابوبکرؓ و عمرؓ (مستند احادیث کی روشنی میں) • جوشِ قدح (دوسرا شعری مجموعہ • مقامات دل (علی گڑھ کے اہم اساتذہ کے بارے میں؛ وغیرہ) • عہد رفتہ (اس عہد کی بعض نام آور، بعض گمنام شخصیتوں پر بے لاگ اور صادقانہ تاثرات پر مشتمل) • شاہین ریگزار (شیخ زاید بن سلطان آل نہیان کی مستند سوانح عمری۔ انگریزی ترجمہ از کلاڈ مارس) • اندیشہ ہائے افلاکی (فارسی مقالات اور ریڈیائی تقریروں پر مشتمل • مجموعہ (اردو زبان میں وقتاً فوقتاً لکھے ہوئے متفرق مضامین اور شہ پارے کتابی شکل میں • Farewell to Yesterday (علی گڑھ کے پانچ سالہ قیام کا جائزہ) • حیات فاروق اعظم، (امام ابوالفرج ابن جوزیؒ کی لازوال تصنیف 'سیرۃ عمرؓ' کا اردو ترجمہ) • دل ریزہ ریزہ (مختلف عمروں اور حیثیتوں کے اشخاص کے نام لکھے ہوئے علمی اور ذاتی خطوط کا مجموعہ) • عربی لطائف (بچوں کے لیے (غیر مطبوعہ) • صفوۃ الصفوۃ (خلفائے اشدین، حضرات حسنین اور صوفیائے کرام بالخصوص حضرت سفیان ثوری کے مختصراً اور دلپذیر تذکرے)۔

Publisher: Atlantis Publications, London, email: shahumerata@gmail.com

***

Thanks for Aligarh Diaspora.

Indeed, all the articles are very interesting and deeply highlight the wide-range of dialogues and the literary activities of a highly-remarkable institution (AMU) of the Indian sub-continent in particular and world in general.

In fact, being the son of an Aligarian, I am well aware of these great academicians, whose, names are mentioned here to bring the attention of the readers for their wisdom, commitment, sincerity, dedication and the generosity for Sir Syed (R.A), Aligarh movement and its dynamic mission around the globe.

Shah Umer Ata

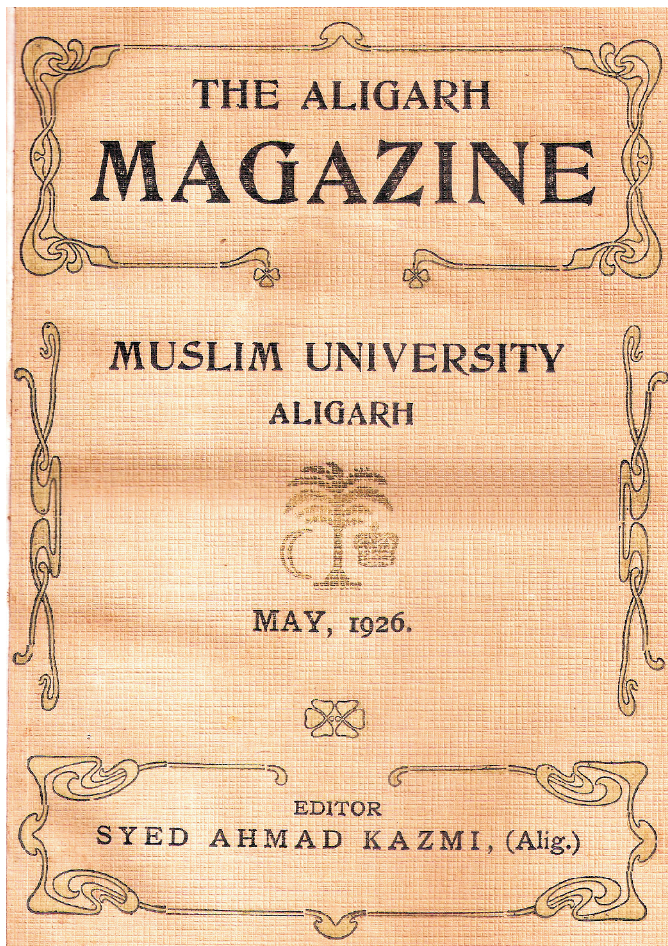
Aligarh Diaspora - 5

Launched to mark the Finalé (December 2021) of AMU Centenary Celebrations 2020-21

One of the best writings on Sufism : A gift from Aligarh Magazine, 1926

SUFISM : ITS ORIGIN & DEVELOPMENT

by Urooj Ahmad Khan



IN the third Century Hijri Islam had reached its zenith. Muslim Empire extended from Spain to Persia and the conquest of Islam in the arts of peace was even more than established. Old books and forgotten literatures were discovered, translated, improved, and then placed before the world. It is natural, therefore, when we notice that, after the physical and intellectual conquests, Islam was followed not only because it was a true religion, but because it had become a fashion of the day to be a Muslim, to dress like a Muslim and to do what a Muslim does. This feeling unfortunately, degenerated into a mere formal adherance to Islam. If a man followed the prescribed rules in growing his beard, cutting his moustaches, and offered his prayers five times in a mosque through the fear of either the King, public opinion or hell, he was regarded a Muslim. Conscientious people began to show resentment to this spirit. They emphasized intention and mere action as preached by the Moulvis had no value for them. As this was a real disease existing in the body politic of Islam, these men could easily catch the ear of the public and in spite of the many persecutions the movement started by them has gained so much strength that its followers are found everywhere in the Muslim world. The name given to this movement is Sufi'ism or تصوف and its followers are called Sufis.

Until recently the derivation of this term Sufi'ism was in dispute but now it is quite certain that it has been derived from Suf (wool) and so means wool-clad. The term is confirmed by the name of *Pashminapash* which has been given to Sufis in Persia. But the popular Arabic conception is to trace it as derived from Safa (purity). The Sufis believe that it has been derived from اهل الصفه "The people of the bench." European writers whose notorious habit is to show that every thing is from the West identify it to *Gopos* (wise men) generally applied for theosophists.

Now coming to its history and nature of development, we find it as obscure as the etymology itself. In the beginning the term was applied to those persons who from choice used clothing of simplest kind and avoided every form of luxury or ostentation. But this spirit soon developed into what is called Sufi'ism. This development was due to both internal and external influences. The Western writers lay great stress on the external influences and ignore the internal ones. Iqbal very rightly remarks that "no idea can seize a people's soul unless in some sense it is the people'e own. External influences may wake it up from its deep unconscious slumber, but they cannot so to speak create it out of nothing." It is quite clear at least to a Muslim student that though Sufi'ism appears to be alien to the real spirit of Islam it is really its own outcome.

No doubt, we cannot trace back its origin to a single definite cause though one must admit that the rising spirit was considerably affected by the external influences. Hence, I do not see face to face with the European writers, when they affirm that, seeing the mystic tendencies in Christianity, Hinduism, or Budhism, and, driving inspiration from the mystics of these religions, the Muslims adopted mystic ideas and named it Sufi'ism, and after going so far they began to search out in Quran the defence of their deeds and misinterpretting some verses they legalised what was in fact unlawful. To put more bluntly these European writers, who never lose sight of their missionary point of view, mean that Sufis are not Muslims properly so called. I differ from this because I think that Sufi'ism is the natural result in the evolution and progress of Islam. Of course, it derived inspiration from the past experiences of others, but the spirit was never anti-Muslim and their movement was due to chiefly on account of their love towards Islam.

The tendency of every religion is towards ascetism. Theosophy has overthrown many religions of the world. To oppose this revolutionary tide is not an easy task for the orthodox religion. In very rare cases religion has escaped and retained its doctrines. The over emphasis laid on form, however, was not without good results. The most important being, that while Sufi'ism flourished, Islam and its outward form was never successfully overthrown. Sufis never could dare to ignore or belittle the outward practices of Islam.

In the second Century Hijri Islamic world was in great confusion, bloody wars between Ommyads and Abbasids continued for a long time. They were followed by a series of rebellions in Persia which were quelled, after much bloodshed. Religious discussions at Mamun's Court that ought to have promoted a better understanding between the various rival parties gave fuel to the fury of the mob in the street and widened the gulf between them. Thoughtful people wondered at the strange phenomena, that Islam had come to unite people and to substitute the blessings of peace for the horrors of war. But when Islam
horrors of war. But when Islam
was itself made cause for fight and bloodshed and when petty differences in belief instead of being tolerated were made use of by rival parties to achieve their personal end, men of devotional bent of mind thought that there was something wrong in Islam itself. They longingly looked back to days when a Muslim was a brother of another Muslim and when Islam stood for a united organised force not divided against each other as it

then had become, Hafiz the mystic poet harping these sentiments sings

جنگ‌هفتاد و دو ملت همه را عذر بنه
چوں نه دیدند حقیقت ره افسانه زدند

To these pious Muslims the good old days appeared before their vision in direct contrast to the time they were living in. The poverty of the Prophet, the simple life of his companions, and many stories about the self-sacrifice of the Muslims were always remembered. The ascetic tendencies in spite of all the efforts to make Islam a practical religion were present in it. They remembered how Mohamed declared that poverty was his pride and how earnestly he prayed the Almighty to raise him up on the Day of Judgment with the poor (faqirs). Mohomed's saying which affected them most was, that the battle against one's self is more painful and meritorious than the Holy War. "Greater is the work of those who pray than those who fight". Therefore it became an article of faith of every Muslim that all the troubles in the Islamic world are due to the deviation from the path of their fore-father and they began seriously to bring back those days in Arabia as French people of the 17th century has tried to usher in the state of nature. This spirit is mainly responsible for the rise of Sufi'ism in Islam.

Once Sufistic doctrines had taken root in the hearts of the Muslims; as against the schismatics they began to believe that there is truth in every religion and as truth is always originally one all the religions were one. Only they were altered by men to suit their purposes and Islam is the only unadulterated Religion and, therefore, it is the natural religion as well. This attitude led to the sympathetic study of the different religions and the mystic teachings present in them did not fall on deaf ears. Sufis of this stage may be classed as those that have drawn inspirations from religions outside Islam also. It should be noticed here that the Sufis never forgot to search for sanctions for their acts in Quran. The utmost that one can say is that they Muslimised a part of Hindu and Christian religion.

The puritanical simplicity was present as early as in the days of Khalifas. The people used to live simple life in imitation to the companions, but this puritanism misunderstood by the later ages contributed to the spread of ascetism. The early Khalifas used to live simple life not because as they were abstinent but in order to put themselves on equality with their subjects, and to present the traditional mode of the Prophet's life. Ascetism soon took a firm root in the family of Mohamad owing to their persecution and did much in spreading it. The other thing which did much in promoting ascetism in Islam was the fear of the Day of Judgment. Quite early this simplicity appears as the distinctive mark of the strict Muslim and was a silent protest against the worldiness of Ommeyeds. The earliest Sufis were in fact, ascetics and quitists rather than Mystics.

They were inspired by a spirit of strict adherence to the traditional life of their desert ancestors and rejected luxury as "innovation". But now we see a new spirit coming into prominence *i.e.* Sufi'ism. The Sufis were no great enthusiast for tradition, but avoided bodily indulgences as an entanglement of the flesh which hindered the progress of the spirit. They deliberately avoided the normal pleasures and indulgences of the human life and specially marriage, as things which entangle the soul and prevent its spiritual progress. Al-Qushayri has tried in vain to place them as the God's elect and successors of the 'devotees' who succeeded 'followers' and 'companions'. God's elect they may be, but in no sense they were the successors of 'companions'. They were guided by a spirit quite unknown to early Islam. It was partly the outcome of Mohamad's own life, Khalifas simplicity and of the ascetic germs already present in the Quran and partly of the social condition of the time, promoted and helped by the foreign influences. As to the Islamic forces which helped the mystic development I have said enough to serve my purpose. But in spite of that it seems better if I quote some sentences of the mystics of that period to show the nature of the change.

play of wealth and from self-indulgence of strict simplicity of life rather than of voluntary poverty and mortification of occasional retirement from the world and only in rare instances of the

1. "Love is not to be learned from man: it is one of God's gifts and comes His grace."

2. "Gnosis is nearer to silence than to speech."

3. "When gnostics spiritual eye is opened, bodily eye is shut: he sees nothing but God."

4. "O! my God I invoke thee in public as Lords are invoked, but in private as loved ones are invoked. Publicly, I say 'O my Lord' but privately I say O! my beloved."

These ideas, light, knowledge and love form the key-note of the new Sufi'ism. Ultimately they rest upon pantheistic faith which deposed the 'one Transcendant God of Islam worshipped in His stead One Real Being Who dwells and works everywhere, and Whose home is the human heart.' Added to this they were influenced by the traditional retirement of Mohamad to Hira so the hermit life became popular among them.

The early asceticism showed the character of devout quitism of a puritanical abstinence from display of wealth and from self-indulgence of strict simplicity of life rather than of voluntary poverty and mortification of occasional retirement from the world and only in rare instances of the permanent adoption of the hermit life.

New Sufi'ism was inspired by religious ideals other than those which had been dominent in early Islam and which developed from those ideals a theology of its own which for a long time was not admitted as orthodox Asceticism still remained but it began to take a more definite character in the deliberate seeking of poverty and mortification formed the first stage of the great journey which a Sufi had to take. Poverty which amongst the early Muslims was esteemed simply because it reproduced the modest life of Mohamad now assumed greater prominence as a devotional exercise, the term *Faqir* and *Durwesh* became synonimous for Sufi.

Now let us turn and see the foreign influences which helped the development of new Sufi'ism. Von Kremer and Dozy say, that it is an outcome of Indian Vedanta. Merth and Nicholson are for Neo-Platonism and Oleary thinks it to be an Aryan reaction against unemotional semetic religion. There is, no doubt, that each of them influenced the growth of Sufi'ism but not so much as have been impressed by their advocates. My task is quite easier as each of them has contradicted the other to make his own case strong.

As to the theory that it is a reaction of Aryan mind against the conquering semetic religion Nicholson says that it may be partially true. But he says that it is a blunder to say of two similar things that the later is influenced by the former without tracing the actual relation helped by the relevant facts. He says the great princes of Muslim Mysticism were natives of Syria, Egypt and Arabia. Oleary is not quite at this point and brings forward the name of Maruf of Karkh who was a son of Sabian parents. Brown has gone so far as to say that it has been imposed upon it by force and it is historically incorrect. Oleary admits that the proper Zorastian religion was non-ascetic and of national character, but he says that the two free churches, Manicean and Masdekite of Persia show a true ascetic tone and the new converts were Zindiqs. The Persian mystic were either new converts or the sons of such converts so they ought to have inherited the spirit of their fore-fathers. If he could prove such a statement then it is all right, but he never took the trouble of doing so. It is true that these churches very slightly influenced the development but in no case so much as has been impressed by Oleary.

As to the theory of its Indian Vedantic and Budhistic origin, Nicholson says that they forgot that Vedantic inflence upon Islam belongs to a later epoch but he is in favour of Budhistic influence. The theory that it is an outcome of Neo-Platonism has been so often criticised that it needs no further reputation.

Thus we see that the Western Oriental Scholars contradict themselves in their vain efforts to explain away the origin of Sufi'ism outside Islam. In my humble opinion Sufi'ism remains partly a child of Islamic thought and partly it signifies a natural evolution in any progressive creed. Going thus far I think I have said enough about the origin and development of Sufi'ism. The other aspect of Sufi'ism namely how a Sufi attains unity with God and dying he lives again and other interesting things do not come under the present heading, they deserve a more careful study and better description than I was able to put before you. I earnestly desire that man of greater calibre than myself will take interest in the subject and do full justice to it. ***